OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com. DOI: 10.5281/zenodo.10072621

قیامِ پاکستان سے قبل اُردو لسانیات کا منظر نامہ

Scenario of Urdu languages before the creation of Pakistan

Dr. Azeemullah Jundran
S.S.T Govt. High School, Dhunni Kalan, Mandi Baha-ud-Din.

Dr. Muhammad Arshad Ovaisi
Head, Department of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore.

Received on: 06-01-2023 Accepted on: 10-02-2023

Abstract

This paper covers the basics of linguistics. Linguists are agreed upon this point that linguistics is the scientific study of language. This paper depicts clearly that now-a-days study of Urdu Linguistics is on the path of development and promotion. It is inclined towards oral, specialized and phonetic mode. Sub-sectional study of linguistics has generated semantics and stylistics in the discipline of linguistics. Urdu Linguistics now is deeply connected with linguistics and teaching; linguistics and anthropology; and linguistics and literature. Today, it is under discussion whether Urdu Linguistics is Science or Arts.

Keywords: Linguistics, Semantics, Anthropology, Stylistics, Articulatory, Psychology.

یہ مقالہ قیامِ پاکستان سے قبل اُردو لسانیات کے منظر نامہ پر محیط ہے۔ لسانیات کا علم دوسرے علوم کے مقابلہ میں زیادہ پرانا نہیں۔ باضابطہ ایک علم کی حیثیت سے اسے پہچان انیسویں صدی کے نصف آخر میں حاصل ہوئی۔ قدیم زمانے میں لسانیات کو گرامر (صرف و نحو) یا علم اللغۃ یعنی علم اللسان کہا جاتا تھا۔ آج علم اللغۃ کی جگہ فقۃ اللغۃ (فلسفۂ زبان) نے لے لی ہے۔

زبان کی ابتدا کے بارے رسو (Rousseau) (۱۷۱۲ء۔۱۷۷۲ء) کی تصنیف ''زبان کی ابتدا'' بنیادی نوعیت کی حامل ہے۔ جان ہرڈر نے ۱۷۷۲ء میں ایک کتاب "Origin of Language" لکھ کر زبان سے متعلق سائنسی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ انیسویں صدی میں ایک اہم نام فریڈرک شلیگل Schelegal Freidrich (۱۷۷۲ء۔۱۸۹۲ء) کا آتا ہے۔ اُس نے ۱۸۰۸ء میں ایک کتاب ''اہلِ ہند کی زبان اور حکمت'' لکھی۔ اس کتاب میں تقابلی لسانیاتی مطالعہ کی جھلک ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں توضیح لسانیات نے اپنے سائنٹفک اور تجزیاتی رویے کی بنا پر لسانیات کو ایک نئے لہجے اور ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا جس سے لسانیات کا علم فن کے دائرے سے نکل کر سائنس کے منصب پر آ کھڑا ہوا۔ اُس وقت کے ماہرینِ لسانیات میں خصوصاً فرڈی نینڈ ڈی سیسیور (Ferdinand de Sauseure) نے اپنی باضابطہ تحریروں کے ذریعے زبان کی تاریخی و تقابلی کوششوں کی مخالفت کی اور بتایا کہ اصل لسانیات وہ ہے جس میں توضیحی نقطۂ نظر سے زبانوں کا مطالعہ کیا جائے نہ کہ تاریخی و تقابلی مطالعہ پر سارا زور ہو۔ سیسیور نے پہلی بار زبان

(Language)اور بول چال(Parole) کے فرق کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زبان علامتوں کا مکمل نظام ہے جس میں تمام اصطلاحات ایک دوسرے کے پابند اور تابع ہوتی ہیں جب کہ بول چال لسانی گروہ کے افراد کا واقعتاً انفرادی عمل ہے۔ سیسیور نے اپنی کتاب Memoire" کے ذریعے لسانیات عامہ کی راہیں ہموار کیں۔ لسانیات کے اہم شعبے صوتیات کا آغاز بھی باضابطہ بیسویں صدی میں ہی ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں فرانس میں صوتیات پر خاص توجہ دی گئی۔ بعد میں برطانیہ میں بھی لوگوں نے اسے مطالعہ کا موضوع بنایا۔

اُردو لسانیات کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں لغات سے بھی رہنمائی ملتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں پہلے منظوم لغات ترتیب دی گئیں۔ اس کے بعد منثور لغات سامنے آئیں۔ پندرھویں صدی عیسویں سے قبل ایسی لغات لکھی جانی شروع ہو گئی تھیں جن کی حیثیت نصابی تھی۔ ''غرائب اللغات'' کے نام سے سترھویں صدی کے اواخر میں پہلی باقاعدہ اُردو، فارسی لغت ترتیب دی گئی۔ اس نے بھی اردو لسانیات کے مطالعہ میں اہم کردار ادا کیا۔ آگے چل کر تدریسی اغراض کی خاطر اور بھی کئی لغات ترتیب دی گئیں۔

بعد ازاں مستشرقین نے بھی اپنے سیاسی، تجارتی اور مذہبی اغراض و مقاصد کی خاطر اردو زبان کے قواعد اور اس کی فرہنگ و لغات ترتیب دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں نے شوق سے اردو کے قواعد مرتب کیے۔ نصاب کی ترتیب دی اور اصولِ زبان سے متعلق کتابچے لکھے۔ یورپین مستشرقین نے اپنی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنا کر اردو سے متعلق آرا پیش کیں۔

اردو زبان کی قواعد و لغات کے متعلق بہت ساری کتابیں لکھیں۔ لسانیات کے مطالعہ میں ان کتب کی اہمیت آگے چل کر اور بڑھ گئی۔ اہلِ ہند میں اردو زبان کے جدید مطالعے کی شروعات یہیں سے ہو گئیں۔ یورپین کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستانی زبان کو ایک نئی جہت عطا ہوئی۔ اردو میں لسانیاتی شعور کے بنیادی خدوخال ___ لغات اور قواعد ___ سے ہی اردو لسانیات کو مزید ترقی نصیب ہوئی۔

لسانیات زبان کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سائنسی لہجہ کیا ہے اور ہم اسے ایک سائنسی مطالعہ کیوں کہتے ہیں؟ دراصل یہ لسانیات کا جدید روپ ہے جسے ہم سائنسی مطالعے سے محمول کرتے ہیں ورنہ زبان اور زبانوں سے دلچسپی ارباب علم و ادب کو بہت پہلے سے ہی رہی ہے، بلکہ اس کا عمل دخل ہمیں اس وقت سے ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے جب قدیم تہذیبوں میں بولی اور تحریر کے ماخذ کو جادو اور مذہب کے ساتھ جوڑا جاتا تھا۔ دوسری جانب زبان سے عالمانہ دلچسپی رکھنے کا عمل قدیم ترین زمانے میں بھی پایا جاتا ہے جن میں یونان اور روم کا قدیم عہد بھی شامل ہے اور جس کا سلسلہ چوتھی صدی قبل مسیح میں افلاطون سے شروع ہو کر پری شین (Prician) ویرو (Varro) سی سرو (Ciecro) اسٹواکس(Stoics) اور ارسطو(Aristotle) کی تحریروں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جولیس سیزر (Julius Seasar) نے بھی قواعد کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مذہب سے جڑی ہوئی ہندوستان کی قدیم تہذیب میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ پانی نے ''اشٹادھیائے'' لکھ کر علم زبان کی ایک بڑی مثال پیش کی تھی۔ عرب عالموں کے یہاں بھی اس سے متعلق پیش کش ہوئی لیکن بغور جائزہ لیں تو ان سب کا طریقۂ کار محدود اور سائنٹفک مطالعے سے کوسوں دور ہے۔ ان کا دائرۂ کار صرف و نحو

کی حد بندیوں میں گھرا تھا۔ وہ زبان کے قواعد اور اصول کو ہی زبان سے متعلق علم کا سب سے بڑا مقصد جانتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سوچ اور فکر میں تبدیلی آئی اور وہ قواعد اور اصول سے آگے بڑھ کر زبانوں کے ارتقاء اس کی نوعیت، نہج، سمت ور فتار اور اس کے تاریخی پس منظر اور دیگر زبانوں سے اس کے آپسی تعلقات پر بھی توجہ دینے لگے۔ بیسویں صدی میں اس نے اور ارتقا پائی اور زبانوں کی تاریخ و تقابل کے ساتھ ساتھ اس کی توضیح اور تجزیے پر بھی توجہ دی جانے لگی اور پھر یہیں سے زبانوں کے سائنٹفک مطالعے کا آغاز ہوا۔ اس طرح زبانوں کا وہ مطالعہ جو صرف قواعد اور اصول پر مبنی تھا، بیسویں صدی تک آتے آتے اس نے زبانوں کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اب اس میں زبانوں کے قواعد واصول اور تاریخی عوامل سے ہی بحث نہیں کی جاتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے صوتی، صوری اور معنوی پہلوؤں پر بھی توجہ صرف کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس عمل کو ''علم زبان (Philology)'' کی بجائے ''لسانیات '' (Linguistics) جیسی وسیع اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لسانیات کے ارتقا کی اس تاریخ کو شوکت سبزواری نے ان جملوں میں بیان کیا ہے:

''قدیم زمانے میں لسانیات کو گرامر (صرف ونحو) یا علم اللغۃ یعنی علم اللسان کہا جاتا تھا۔ اس وقت یہ علم سادہ اور اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ اس کے مسائل، گرامر اور لغت کے مسائل ومباحث سے گڈ مڈ تھے۔ حد فاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان امتیازی خط نہیں کھینچا جاسکتا تھا۔ لسانیات نے ہ ایک قدم آگے رکھا اور گرامر کی چہار دیواری توڑ کر باہر آئی تو اس کا نام ''علم اللغۃ'' (زبان کا علم) کی جگہ ''فقۃ اللغت'' (زبان کا فلسفہ) قرار پایا۔ آج ہم گرامر کے اس اگلے قدم کو ''لسانیات'' کہتے ہیں۔ لسانی مسائل کا پہلا قدم گرامر تھا۔ دوسرا قدم قدیم زبان میں ''فقہ اللغۃ'' اور جدید زبان میں ''لسانیات'' ہے۔''(۱)

یہ حقیقت ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے اور سماج سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں لیکن انسان کے سماج میں رہنے کے لیے ایک ایسے نظام کی تشکیل ضروری ہے جس کے تحت سب لوگ آپسی میل جول اور باہمی اتفاق کے ساتھ رہ سکیں، ایک دوسرے کی ضرورتوں کو سمجھ سکیں اور اپنے مسائل کا تدارک کر سکیں۔

سماج کے ارتقائی نظریہ سے پرے ہمارے ذہن میں ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ زبان کی پیدائش اور ارتقا کیا واقعی فطری طور پر ہوا یا یہ ودیعتِ خداوندی ہے اور اگر یہ ودیعتِ خداوندی ہے تو پوری دنیا میں ایک ہی زبان کیوں نہیں بولی جاتی اور ان کے بولنے والے ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں یا پھر یہ کہ زبان کیا ہے؟ یہ کیسے وجود میں آتی ہے؟ اس کا ارتقائی عمل کس طرح طے پاتا ہے؟ اس طرح کے سیکڑوں ایسے سوالات ہیں جو ہمارے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں لہٰذا جس علم کے تحت صیغۂ راز میں چھپے ان سوالات تک ہم رسائی حاصل کرتے ہیں اسے ہی زبانوں کا علم یعنی علم لسانیات (Linguistics) کہتے ہیں اور جو لوگ اس علم کی تحقیق کرتے ہیں انہیں ماہر لسانیات (Linguist) کہا جاتا ہے۔

اس ضمن میں تفصیلی وضاحت کے لیے قدیم اور جدید علما کے نظریات کا مطالعہ لازمی ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ زبان کی نوعیت کو سمجھنے

کی سب سے پہلی کوشش غالباً بابل میں کی گئی۔ سئیس، اے، ایچ لکھتا ہے کہ تقابلی لسانیات کی قسم کی سب سے پہلی کوئی تحریر بابل ہی کے آثار میں ملتی ہے۔ بابل کے لوگ جو زبان بولتے تھے وہ اکاوی، ین کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ اس زبان کا رواج سترھویں صدی قبل مسیح میں مفقود ہو گیا تھا۔ اس لیے اس سرزمین پر بعد کو جو قوم آباد ہوئی اسے پرانی زبان سمجھنے کے لیے لغات اور قواعد لکھنے کی ضرورت پڑی۔ اہلِ بابل نے اس کوشش کو جاری رکھتے ہوئے کئی کارنامے انجام دیئے۔ لغات ترتیب دی، قواعد لکھی، تدوین کے سلسلے میں مشترک مادوں کی چھان بین کی، جسے دیکھتے ہوئے علما نے اس بات سے اتفاق کیا کہ مادوں کا اصول ہی دراصل علمِ زبان کا بنیادی اصول ہے۔ اس طرح اہلِ بابل کی کوشش، اولین لسانی کوشش تصور کی جانی چاہیے۔ دوسری جانب دیگر مذہبی کتابوں میں جس طرح زبان کے ابتدائی نظریے مذکور ہیں انہیں بھی ہم لسانیاتی تاریخ کی ابتدائی کڑی مان سکتے ہیں۔ عہد نامۂ عتیق (Old Testment) میں زبان کی ابتداء سے متعلق بیان یوں درج ہے:

''اور خداوندِ خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور ان کو آدمؑ کے پاس لایا کہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدمؑ نے جس جانور کو جو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا۔''(۲)

یعنی اس قول کے مطابق دنیا میں جتنی بھی اشیا ہیں کا خالق خدا ہے لیکن انہیں نام آدمؑ نے عطا کیا۔

مشہور یونانی فلاسفر اور مفکر افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) بھی زبان کے مافوق الفطری ماخذ کا حامی نظر آتا ہے مگر وہ اس پہلو پر کچھ متذبذب ضرور تھا جیسا کہ اس کی تصنیف ''کریٹیلس (Cratylus)'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ افلاطون اس کتاب میں ایک جگہ یہودی نظریے کو تسلیم کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''آخر زبان کے اوّلین الفاظ کس طرح وضع کیے گئے اور وہ کون سے اصول و ضوابط تھے جنہوں نے الفاظ کی تشکیل کے عمل میں رہنمائی کی۔''(۳)

ظاہر ہے یہاں پر افلاطون اپنے نظریے میں کچھ متذبذب نظر آرہا ہے۔ جہاں تک لسانیات کے ابتدائی روپ، قواعد کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا عہدِ قدیم میں سب سے پہلے یونان اور پھر روم میں ہوئی۔ عہدِ قدیم میں عربوں کے یہاں بھی لسانی شعور کی بیداری اور لسانی مسائل پر غور و فکر کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

چودھویں صدی کے قریب یورپ کے کچھ علما نے لاطینی اور یونانی زبانوں کے ساتھ ساتھ عبرانی اور سامی زبانوں کی جانب بھی توجہ دی۔ سامی قوموں اور عربوں نے بھی اپنے لسانی مطالعے کی عمارت قدیم بابلی روایات کی بنیادوں پر کھڑی کی اور ساتویں صدی عیسوی میں ابو الاسود (متوفی ۶۸۸) نے عربی قواعد کا حقیقی سنگ بنیاد رکھا۔ بعد میں بصرہ اور کوفہ کے علما نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اسی طرح تدوینِ قواعدِ لسان سے متعلق سیبویہ کی اوّلین کوشش بھی قابلِ قدر ہے:

''قدیم ہندوستان میں بھی علمِ زبان کی ابتدا قواعد نویسی کی شکل میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں قواعد نویسوں نے ہی زبان کے اصول اور

تربیت کی جانب دھیان دیا۔ ہندوستان کی سب سے پہلی گرامر یاسک کی ''نِرکتی'' کو قرار دیا جاتا ہے۔(۵۲) یہ گرامر سنسکرت زبان میں ہے اس کے بعد اس دور کی سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف پانی کی ''اشٹادھیائے'' سامنے آتی ہے۔ اس کتاب میں پانی نے زبان و قواعد سے متعلق ایسا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے جس نے آج سے ڈھائی ہزار سال قبل ہی زبان کے مطالعے کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اس سے تحریک پاکر کئی کامیاب قواعدیں سامنے آئیں لیکن ان میں کسی کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ''اشٹادھیائے'' کو حاصل ہوئی۔''(۴)

پانی اور پاتنجلی کے دور سے آگے بڑھیے تو ہندوستانی لسانی منظر نامے پر پراکرت زبان مضبوطی کے ساتھ اپنا قدم جمائے نظر آتی ہیں۔ ان زبانوں کی بھی قواعدیں اور تفسیریں مرتب ہوئیں۔

''ہیم چندر (۱۰۸۸ءتا1172ء) نے بارھویں صدی میں ''ہیم چندر شبدانوشاسن'' کے نام سے پراکرت کی مشہور قواعد لکھی۔''(۵)

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کی فکر میں وسعت آئی اور لسانیات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

سولہویں صدی عیسوی میں عیسائی مبلغین برصغیر میں وارد ہونا شروع ہو گئے انھوں نے زبان، ثقافت، مقامی قواعد پر دسترس حاصل کی اور قواعد و لغات پر کام شروع کیا۔ ان مبلغین میں پہلا نام جرنیمو ژاد(Jeronemo Xavier) کا ہے۔ اس نے ایک لغت Vocabularium Portu Galico Hindustano-Persicum مرتب کی۔ یہ لغت سولہویں صدی کی آخری دہائی میں منظرِ عام پر آئی اسے بڑی پذیرائی ملی۔

مسٹر انٹونیو سلدھانا(Antonio Saldhana) کا مرتبہ دُعاؤں کا مجموعہ ہندوستانی زبان میں منظرِ عام پر آیا۔ آئیگاسیو آرکامونے (Igasio Arcomone) نے لاطینی ڈکشنری تالیف کی جس میں بنیادی قواعد بھی درج تھیں۔

علمِ زبان کے مطالعے کا باضابطہ رواج سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ واسکوڈی گاما نے ۱۴۹۸ میں جب سرزمینِ ہند پر اپنا پہلا قدم رکھا تب کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان کی سیاست، سماج اور علوم کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر شعبے میں اتنی زبردست تبدیلی آئے گی۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے وہاں ان کی ملاقات الگ الگ ملکوں کی زبانوں سے ہوئی۔ ان ملکوں میں مذہبی، اشاعت اور تجارت کی خاطر انہیں دوسری زبانیں سیکھنے کی ضرورت پڑی۔ ان ضرورتوں کے تحت ان لوگوں نے زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا۔ مطالعے کے دوران فطری طور پر بعض زبانوں کی اندرونی مماثلت کا انہیں علم ہوا۔ یہی نہیں بعض مشنریوں نے دوسری زبانوں کی قواعد پر بھی اظہارِ خیال کیا تب انہیں پتا چلا کہ دنیا کی عرض و طول میں پھیلی ان زبانوں کا ایک بڑا حصہ ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں پادری گیوسپ بارباہرنینی کی کئی کتب منظرِ عام پر آئیں، ان میں '' اطالوی ہندی لغت''اہمیت کی حامل ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں مختلف علوم کے احیا کا زمانہ عروج پر تھا اسی وقت نظریۂ ارتقا کا ظہور بھی ایک اہم واقعے کی شکل میں سامنے آیا۔ اس واقعے نے ہمارے تمام علوم و فنون بلکہ تمام انسانی تصورات کو جس حد تک متاثر کیا اس کا کلی طور پر احاطہ کرنا آج بھی دشوار ہے۔ علم اللسان کا تعلق بھی براہِ راست نظریۂ ارتقا کا ہی نتیجہ ہے۔ اس لیے ڈارون(Darwin)، بونان(Bonan)،

لامارک (Lamark)، کانٹ (Kant) اور ہرڈر (Herder) جیسے سائنس دانوں نے انسانی ارتقا کے نظریے کے ساتھ ساتھ اس کے اہم پہلو، زبان پر بھی روشنی ڈالی۔ (۶)

اس وقت اس خیال نے زور پکڑا کہ زبان کی ابتدا کسی مافوق الفطری طریقے سے نہیں بلکہ عین فطری طریقے سے عمل میں آئی ہے۔ اس پہلو پر لکھی گئی مشہور انقلابی فلاسفر روسو (Rousseau) (۱۷۱۲ تا ۱۷۷۸) کی تصنیف ''زبان کی ابتدا'' بہت اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کے غایر مطالعے سے روسو کے یہاں بھی افلاطون کی کریٹیلس (Cratylus) کی طرح ایک تذبذب کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس میں ایک جانب زبان کے مافوق الفطری ماخذ کی تائید کی گئی ہے تو دوسری جانب زبانوں کو وہ کچھ قدرتی امور کا نتیجہ بھی بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے Condillac نے اپنے خیال کا یوں اظہار کیا کہ پہلے پہل انسان نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے چلانا اور چیخنا شروع کیا ہوگا، پرانہی آوازوں کو ترسیل کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ جو پھر آگے چل کر زبان کی شکل میں سامنے آئی لیکن اس زمانے میں جو مقبولیت جان ہرڈر (J. Herder) کو حاصل ہوئی اس کے سامنے زبان سے متعلق سارے نظریے پھیکے پڑ گئے۔ جان ہرڈر نے زبانون کی ابتدا سے متعلق مطالعے کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔

''ہرڈر مشہور سائنس دان اور فلاسفر کانٹ (Kant) کا شاگرد اور گوئٹے کا گہرا دوست تھا۔ اس نے ۱۷۷۲ء میں ایک کتاب "Origin of Language" (زبان کا ماخذ) لکھ کر زبان سے متعلق سائنسی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنی تحقیقات سے اس امر کو ثابت کیا کہ زبان کسی مافوق الفطری ہستی کا عطیہ نہیں بلکہ انسان کی اپنی کاوشوں اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔''(۷)

اس طرح اس نے اپنے عہد کے سخت اصولوں اور مذہب پرستوں کے اس خیال سے اختلاف کیا کہ ''زبان کسی انسان کے ذریعے نہیں بلکہ خدا کا عطیہ ہوتی ہے۔'' اس نے بتایا کہ اگر زبان خدا کی دین ہوتی تو زیادہ منطقی اور مکمل ہوتی۔ رائج شدہ زبانیں اتنی بے ترتیب اور بے اصولی ہیں کہ یہ خدا کے منظم اصول کی جانب بالکل اشارہ نہیں کرتی۔ اس میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں ملتی ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ انسان نے زبان کی تخلیق کی ہوگی جو فطری تقاضوں کے تحت آگے بڑھتی رہی اور آہستہ آہستہ تدریجی طور پر اس کا ارتقا ہوا۔ اس طرح ہرڈر (Herder) نے آنے والی نسلوں کے لیے زبان کا مطالعہ آسان بنا دیا۔ اس نے مختلف مشرقی زبانوں کا مطالعہ کر کے اس سے متعلق اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔

ہندوستان میں بھی باقاعدہ لسانیاتی مطالعے کا آغاز یورپی علما کے ذریعے ہوا۔ جیسا کہ پہلے یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ واسکوڈ گاما نے جب ہندوستان کا راستہ دریافت کر لیا تو اہلِ یورپ کی آمد و رفت ہندوستان میں زور پکڑنے لگی۔ ابتداً عیسائی پادریوں کے ذریعے گاہے گاہے یہاں کی خبریں یورپ تک پہنچتی رہیں۔ دھیرے دھیرے یہاں کی تہذیب و کلچر کے ساتھ یہاں کی زبانوں کی خصوصیات بھی اہلِ یورپ کے کانوں تک پہنچیں۔ خصوصاً کلکتہ میں ایشاٹک سوسائٹی کی بنیاد سے اس جانب نئی پیش قدمی ہوئی اور تقابلی لسانیات کا وجود عمل میں آیا۔ اس ضمن میں ولیم جونس کا نام خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے:

''سر ولیم جونس(Sir William Jones)ایک انگریز قانون دان تھا۔ جس نے اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی مختلف زبانوں میں دلچسپی لیناشروع کر دیا تھا۔''(۸)

یورپ میں لسانی مطالعے کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا جس کا نقطۂ آغاز ولیم جونس کی تحقیق مانی جاتی ہے۔

اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے دوران یورپ کے بہت سے علما ہندوستان تشریف لائے جن میں زیادہ تر علما نے لسانی مطالعے کی تحقیقات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہاں کیلٹک کی مختلف زبانوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس زمانے میں ایک اہم نام فریڈرک شلیگل(Friedrich Schelegal)(۱۷۷۲ءتا۱۸۲۹ء)کا آتا ہے۔ یہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔اس نے ۱۸۰۸ء میں ایک کتاب ''اہل ہند کی زبان اور حکمت'' کے نام سے لکھی، جس میں ولیم جونس کے تجویز کردہ خیالات کے مطابق یورپی زبانوں کا سنسکرت سے تفصیلی موازنہ پیش کیا گیا تھا۔ان زبانوں کے الفاظ اور صرف و نحو کی مماثلت کے مطالعے کے بعد اس نے اس خیال کی پُر زور حمایت کی کہ سنسکرت اور یورپی زبانوں خاص کر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہری رشتہ اور یک گونہ مطابقت موجود ہے:

''یہی وہ پہلا شخص تھا جو سب سے پہلے تقابلی لسانیات دانوں کے نظریۂ حیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔''(۹)

ان لوگوں نے جہاں ایک جانب جدید ہند آریائی زبانوں کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق عالمانہ بحث پیش کی وہیں دوسری جانب اپنی کوششوں اور کاوشوں سے علمِ لسانیات کو اس کے محدود دائرے سے نکال کر ایسی وسعت عطا کی جس نے اس علم کو ہر خاص و عام کے مطالعے کی چیز بنا دیا۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھی گئی متعدد قواعد میں ہیڈلے اور گل کرسٹ کے طے کردہ معیارات کا پرتو ہے۔ کیپٹن جوزف ٹیلر نے ڈکشنری ''ہندوستانی قواعد انگلش''۱۸۰۵ء میں لکھی۔ میکال سمتھ کی ''اردو انگریزی کی لغت'' ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی۔

اس دور کے لسانیاتی محققین میں کئی جہتوں سے اینگلو جرمن ماہرِ لسانیات میکس مولر (۱۸۲۲ءتا۱۹۰۰ء)اور امریکی ماہرِ لسانیات ولیم وھٹنے (۱۸۲۷ءتا۱۸۹۴ء) کے نام خاص طور پر سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں کو فرانز بوپ کے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ان لوگوں کا لسانیات کے متعلق وہی نظریہ اور نصب العین تھا جو کہ چارلس ڈاروں کا حیات سے متعلق تھا۔

ان لوگوں کا ماننا تھا کہ زبان ایک فطری عمل ہے اور اسی عمل کے زیرِ اثر اس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا چولا بدلا اور آج مختلف شکلوں میں یہ ہمارے سامنے موجود ہے۔اس میں وھٹنے کی تصنیفات ''زبان اور اس کا مطالعہ'' اور ''زبان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما'' لسانیاتی تاریخ میں اپنی ایک اہم پہچان رکھتی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بالترتیب ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئیں۔ وھٹنے نے سنسکرت زبان اور قواعد پر بھی متعدد کتابیں لکھیں جن میں واقعات کو صحیح تاریخی تناسب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انہی لوگوں کی کوششوں سے یورپ کے ساتھ ساتھ امریکا میں بھی لسانیاتی مطالعے کی روش عام ہوئی۔

بیسویں صدی لسانیات کی دنیا میں ایک نئی روشنی لاتی ہے۔اس صدی کی ابتدا میں جہاں بہت سے فرسودہ نظریے متروک ہوئے ہیں وہیں کئی نئے نظریے کھل کر سامنے آئے۔ اسی وقت زبان کا توضیحی اور تجزیاتی مطالعہ سامنے آیا۔اس سے قبل زبانوں کے تقابلی اور تاریخی مطالعے پر

زیادہ زور صرف کیا جاتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں اس کی جانب زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ بیسویں صدی میں توضیحی لسانیات نے اپنے سائنٹفک اور تجزیاتی رویے کی بنا پر لسانیات کو ایک نئے لہجے اور ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا جس سے لسانیات کا علم فن کے دائرے سے نکل کر سائنس کے منصب پر آ کھڑا ہوا۔

بیسویں صدی میں توضیحی اور تجزیاتی لسانیات کے بنیاد گزاروں میں یورپ اور امریکا کے ماہرین کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً فرڈی نینڈ ڈی سیسیور (Ferdinand de Saussure)، بلوم فیلڈ (Bllomfield)، فرانز بواز (Franz Boas) اور ایڈورڈ اسپیر (Edward Sapir) کے پیش کردہ لسانی افکار اور نظریات سے جدید لسانیات کا ارتقا عمل میں آیا۔ ان لوگوں نے زبان کے مطالعے کو سائنس کا مرتبہ دیا اور اس کے مطالعے کے لیے نئی نئی راہیں ہموار کیں، زبانوں کا مطالعہ نئے انداز سے کیا جانے لگا اور زبان کی ساخت اور اس کی ہیئت کی توضیح و تجزیے میں معروضی، تجزیاتی اور سائنسی طریق کار کو اولیت دی گئی۔ اس وقت کے ماہرینِ لسانیات میں خصوصاً فرڈی نینڈ ڈی سسیور (۱۸۵۷ء) کے لسانی تصورات بیسویں صدی کی جدید لسانیات میں اپنی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے باضابطہ اپنی تحریروں کے ذریعے زبان کی تاریخی و تقابلی کوششوں کو مخالفت کی اور بتایا کہ اصل لسانیات وہ ہے جس میں توضیحی نقطۂ نظر سے زبانوں کا مطالعہ کیا جائے نہ کہ تاریخی و تقابلی مطالعے پر سارا زور صرف ہو۔ سسیور علامات کو خود اختیاری قرار دیتا ہے لیکن خود اختیاری سے مراد بولنے والے کی مرضی اور اس کا بلا روک ٹوک انتخاب نہیں بلکہ درجہ بہ درجہ خود اس کا استعمال ہے۔ اس نے پہلی بار زبان (Language) اور بول چال (Parole) کے فرق و امتیاز کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زبان علامتوں کا مکمل نظام ہے جو لسانی گروہ میں ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے اور بول چال اس کا استعمال ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبان ایک ایسا نظام ہے جس میں تمام اصطلاحیں ایک دوسرے کے تابع اور پابند ہوتی ہیں اور ایک اصطلاح کی قدر و قیمت دوسری اصطلاحوں کی موجودگی سے اخذ یا متعین ہوتی ہے جبکہ بول چال لسانی گروہ کے افراد کا واقعتاً انفرادی عمل ہے جو نظام کے موقع محل کے لحاظ سے استعمال ہوتی ہے۔

سسیور سے قبل انیسویں صدی میں اسٹائن تھال، ہرمان پال، کال بروگ من اور ہرمان اوستھاف وغیرہ ایسے نئے قواعد نگار گزرے ہیں جنہوں نے تاریخِ زبان کے اصول اور تاریخی لسانیات پر مستند کام کیا۔ ان لوگوں کے نزدیک لسانی مواد کی توضیح یا لسانی بیان کی حیثیت محض اور درسی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے تقابلی و تاریخی لسانیات کو اولیت دی اور توضیحی لسانیات سے بے اعتنائی برتی۔ لیکن سسیور نے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی اور زبان کی توضیح پر زیادہ زور دیا۔ اس نے زبان کے مطالعے کی دو صورتیں بتائیں ایک Synchronic یعنی توضیحی یا تجزیاتی اور دوسرے Diachronic یعنی ارتقائی یا تاریخی، پہلی قسم میں کسی مخصوص دور میں زبنا کے رکھ رکھاؤ، اس کی آوازوں، کلموں اور گرامروں کو بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے جبکہ دوسری قسم میں زبانوں کے اصولوں کو موضوع بحث بناتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ کسی زبان میں ہونے والے تغیر و تبدل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ سسیور کی کتاب "Memoire" نے اس موضوع پر کھل کر بحث کی اور تجزیاتی لسانیات کے ساتھ ساتھ ان نے تقابلی قواعد کو بھی نئے افق سے روشناس کرایا۔ اس طرح سیسور نے

لسانیاتِ عامہ کی نئی راہیں استوار کیں۔

سسیور کے ان تصورات کا سوئٹزر لینڈ، زیکو سلاویکیہ، فرانس اور ڈنمارک جیسے ممالک میں کافی فروغ ہوا۔ ان سے تحریک پاکر امریکا میں بھی لسانیاتی تحقیق کے در کھل گئے۔ ان میں دو نام ایسے ہیں جنہوں نے امریکا میں لسانیاتی مطالعے کو ایک اہم مقام عطا کیا۔ ان میں ایک نام ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir)(۱۸۸۴ء تا ۱۹۳۹ء) اور دوسرا نام بلوم فیلڈ (Bloomfield) (۱۸۸۷ء تا ۱۹۹۴ء) ہے۔ ان دونوں کی اہم نام کتابیں "Language" امریکی لسانیات کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے پورے عالم میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس تبدیلی نے جہاں فرانس اور امریکا کو نئے نئے انقلاب سے روشناس کرایا وہیں بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی پہلی جنگ عظیم کے اثرات نے علوم وفنون اور زندگی کے تمام شعبے کو بے حد متاثر کیا۔ اس وقت جہاں کئی فرسودہ اور پرانے نظریے متروک ہوئے وہیں پرانے نظریوں سے غذا حاصل کر کے علما نے نئے نئے علوم کے انکشافات بھی کیے۔ لسانیات کا ایک اہم شعبہ ''صوتیات'' کا آغاز بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ صوتیات، لسانیات کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں آوازوں کے مخرج اور زبانوں میں ان آوازوں کے رول سے بحث کی جاتی ہے۔ صوتیات پر توجہ یوں تو انیسویں صدی کے وسط سے ہی دینی شروع ہو گئی تھی لیکن اسے ایک باضابطہ علم کی حیثیت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں فرانس میں سوتیات کی جانب خاص طور سے توجہ دی گئی۔ آگے چل کر برطانیہ میں بھی لوگوں نے اسے اپنے مطالعے کا مرکز بنایا اور اس سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ امریکا میں ہنری سویٹ اور ڈینلجونز جیسے ماہرینِ صوتیات پیدا ہوئے۔

گذشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں اسلوبیات، ساختیات، پس ساختیات اور نشانیات جیسے علوم نے علمِ لسانیات کو نئی تقویت بخشی ہے۔ اب زبانوں کا مطالعہ کئی جہتوں کو سامنے رکھ کر کیا جانے لگا ہے۔ حتیٰ کہ آج لسانیات کا علم زبان وادب، عمرانیات، بشریات، نفسیات، فلسفہ، ریاضی اور مشینی ترجمہ جیسے شعبے کے لیے بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس طرح آج لسانیات کا دائرہ نہایت وسیع ہو چلا ہے اور اس علم سے متعلق دن بہ دن نئے نکات سامنے آرہے ہیں۔

جہاں تک اُردو میں لسانیات کے آغاز کا سوال ہے تو کم وبیش اس کا سلسلہ ہمیں اسی وقت سے ملنا شروع ہو جاتا ہے جب اُردو کا وجود عمل میں آیا۔ لسانیات کی جدید تعریف کے مطابق ہر وہ موضوع جو زبان سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتا ہے وہ سب لسانیات کے دائرے میں آتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق لغت سے، قواعد سے، علم اشتقاق سے، صوتیات، اسلوبیات، معنیات، رسم الخط یا کسی بھی شعبے سے ہو، اس اعتبار سے اگر دیکھیں تو اُردو میں لسانیات کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو زبان۔

غور کریں تو اُردو لسانیات کی غیر متعینہ شکل ہمیں امیر خسرو کے یہاں ہی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ امیر خسرو کو ہندوی یعنی زبانِ دہلوی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی تخلیقات میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ اردو کی ابتدا سے متعلق مطالعے میں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ خصوصاً اپنی مختلف مثنویوں میں امیر خسرو نے ہندوستانی زبان کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے پس پردہ کہیں نہ کہیں انکا

لسانیاتی شعور ضرور کار فرما رہا ہے۔ مثنوی ''حضر خاں اور دول رانی'' میں ہندی زبان کے صرف و نحو اور معنی و مفہوم سے متعلق جو باتیں بیان ہیں نیز ''نہ سپہر'' کے دیباچے میں ہندوستانی زبان کا ذکر اور ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں ہندوستان اور یہاں کی فارسی دانی کی تعریف کا موجود ہونا ان کے لسانیاتی شعور کا پتا دیتا ہے۔

یوں لسانیات سے براہِ راست نہ سہی لیکن بالواسطہ طور پر ان کی یہ واقفیت اردو کی لسانیاتی تحقیق کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس نے آگے چل کر اردو زبان میں لسانیاتی تحقیق اور مطالعے کی نئی راہیں ہموار کیں۔

امیر خسرو کے بعد ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو ایک ایسا تغیر و تبدل نظر آتا ہے جس نے اردو کا مرکز شمالی ہند کی بجائے سر زمینِ دکن کو بنایا اور ایک عرصے تک اردو زبان ایک غیر آریائی سر زمین میں پھلتی اور پھولتی رہی۔ زمانے نے پھر کروٹ بدلی اور مغلوں کی سیاسی پہل قدمی کی وجہ سے اردو نے پھر شمال کا رخ کیا۔ اب یہاں اس کا سامنا عربی، فارسی، ترکی اور دیگر ہندوستانی زبانوں سے ہوا۔ اس طرح یہ پھر ایک اجنبی ماحول سے نکل کر ایک آشنا ماحول میں سانس لینے لگی:

''شمالی ہند میں اس وقت مغلیہ حکومت کا دور دورہ تھا۔ یہ لوگ ترکی نسل سے تھے اور ان کا تعلق ایران و افغان سے تھا۔ یہ لوگ فارسی، عربی یا ترکی بولتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ یہاں حکومت قائم ہو جانے کے بعد خصوصاً فارسی کو ان لوگوں نے اولیت دی اور یہی حکومت کی زبان قرار پائی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب ان لوگوں کا رابطہ ہندوستانیوں سے ہوا تو دونوں کے اشتراک سے دھیرے دھیرے ایک ایسی زبان نے جنم لینا شروع کیا جس کی ساخت تو ہندوستانی تھی لیکن چولا عربی اور فارسی کا تھا، یہ وہی زبان تھی جسے آج ہم ''اردو'' کے نام سے جانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ اردو ایک مخلوط زبان کی حیثیت سے ہر خاص و عام میں مقبول ہونے لگی۔ خصوصاً عالم گیر کے عہد تک آتے آتے اس نے اپنی ترقی کی کئی منزلیں طے کی اور دکن سے شمال تک اس کا چرچا عام ہوا۔ اس بیچ لوگوں نے اسے اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنانا شروع کیا اور اس میں شعر و شاعری بھی کی۔''(۱۰)

ایک مخطوط زبان ہونے کے ناتے اردو میں جہاں ایک جانب عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے وہیں کچھ ایسے الفاظ بھی جگہ پانے لگے جو خالص ہندوستانی اور سنسکرت سے مشابہ تھے۔ ایسے الفاظ کا سمجھنا غیر اردو داں کے لیے جہاں دشوار تھا وہیں ایک عوامی زبان ہونے کے ناتے اس کا جاننا ناگزیر بھی تھا چنانچہ انہی ضرورتوں کے مدِ نظر اس وقت کئی ایسی ذو لسانی لغات ترتیب دی گئیں جس نے آگے چل کر اردو کے لسانیاتی مطالعے میں ایک سند کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ تمام لغات جو اس وقت ترتیب دی گئیں گرچہ ان کا ذریعۂ اظہار فارسی تھی لیکن چوں کہ اس کا موضوع بحث اس وقت کی ہندوستانی یعنی اردو اور اس کے الفاظ کی وضاحت و صراحت ہے اس لیے اردو لسانیات کے ابتدائی نقوش کی تلاش ہمیں یہیں سے کرنی چاہیے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں پہلے پہل منظوم لغات ترتیب دی گئیں اس کے بعد منثور لغات سامنے آئی۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام میر خسرو کی ''خالقِ باری'' کا آتا ہے جس سے تحریک پا کر اس طرح کی کئی لغات ترتیب دی گئیں۔ جیسے صمدِ باری (عبد الواسع

ہانسوی)، حمدِ باری (عبدالسمیع رام پوری)، اللہ باری (حافظ احسن اللہ لاہوری)، رازقِ باری (اسماعیل)، قادرِ باری (فیاض عسکری) وغیرہ۔ یہ الگ بات ہے کہ ''خالقِ باری'' امیر خسرو کی ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں ابھی بھی مؤرخین کے بیچ اختلاف پایا جاتا ہے۔ خصوصاً محمود شیرانی (مقدمہ حفظ اللسان خالقِ باری، ۱۹۴۷ء) نے اپنے قوسین کے مضمون میں مختلف دلائل و براہین کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب امیر خسرو کی نہیں بلکہ بہت بعد کی لکھی ہوئی کسی ضیاءالدین خسرو کی ہے جس کا تعلق جہانگیر کے زمانے سے تھا۔ جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے:

''خالقِ باری، بھی انہی کی تصنیف ہے جس میں صدیوں کی دھوپ چھاؤں نے اضافوں اور ملحقات سے اس کی شکل بدل کر رکھ دی اور آج محمود شیرانی جیسے فاضل اُجل کو یہ شبہ ہوا کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔''(۱۱)

محمود شیرانی نے اس کی سنہ تصنیف ۱۰۳۱ھ بتائی ہے۔ اگر اس تحقیق کو سچ مان لیا جائے تو شمالی ہند میں لکھے گئے اس قسم کے نصاب ناموں میں حکم یوسفی ہروی (ہراتی) کی لغت ''قصیدہ در لغاتِ ہندی'' کو تقدمِ زمانی حاصل ہو جاتا ہے جو دسویں صدی ہجری کے نصف اوّل ۹۵۰ھ بمطابق ۱۵۴۶ء میں ہمایوں کے عہد میں لکھی گئی۔(۱۲) اس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا بھی یہی خیال ہے کہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ سب سے قدیم تصنیف ہے۔(۱۳) اگر یہ درست ہے تو پھر اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی سے قبل ایسی لغات لکھی جانی شروع ہو گئی تھی، جس کی حیثیت نصابی تھی اور جس میں اس وقت مستعمل ہونے والے اردو الفاظ کو ذکر شامل تھا۔ ان لغات کا خاص مقصد ہندوستان کے ٹھیٹھ الفاظ کے مفہوم سے لوگوں کو روشناس کرتا تھا۔ بعد کو یہ سلسلہ جاری رہا۔ خصوصاً اورنگ زیب کے زمانے میں یہ لسانیاتی شعور اور پختہ ہوا اور اسی وقت میر عبدالواسع ہانسوی نے ''غرائب اللغات'' کے نام سے پہلی باقاعدہ اردو، فارسی لغت ترتیب دی۔ تقریباً سترھویں صدی کے اواخر میں اسے ترتیب دیا گیا۔ اگرچہ اس کی حیثیت بھی نصابی تھی لیکن اس میں اُردو زبان کے الفاظ، اس کے معانی اور مترادفات کو جس صراحت کے ساتھ موضوع بحث بنایا گیا ہے اس نے اُردو لسانیات کے مطالعے میں اسے ایک اہم مقام عطا کیا۔

اس زمانے کے ان اصلاحی اور تدریسی کارناموں کے بعد ہماری نظر ان مستشرقین کی جانب جاتی ہے جن کا تعلق گرچہ انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں سے تھا لیکن اپنے سیاسی، تجارتی اور مذہبی اغراض و مقاصد کی خاطر انہوں نے اردو زبان کی قواعد اور اس کے اصول مرتب کرنے اور اس کی فرہنگ و لغات ترتیب دینے میں جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اسے اردو لسانیات کی روایت میں ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گرچہ ان مستشرقین کی لسانی خدمات کا جائزہ بعد کی بحث میں تفصیل سے لیا جائے گا لیکن ضروری ہے کہ یہاں بھی ان پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے تاکہ اردو لسانیات کے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ان یورپین علما میں ڈچ، پرتگال، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور انگریزی، ان سبھی علما کی کاوشیں موجود ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت شوق و انہماک کے ساتھ اردو کے قواعد مرتب کی، نصاب کی ترتیب دی اور اصولِ زبان سے متعلق کتابچے لکھے۔ اگرچہ ان لوگوں کی زبان یورپی تھی اور انہوں نے اپنی ہی زبان یعنی پرتگالی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور اطالوی جیسی زبانوں

کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن باوجود اس کے ہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ جس طرح عبدالواسع ہانسوی، خان آرزو اور انشا وغیرہ نے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا کر اپنی بحثیں پیش کیں۔ اسی طرح ان یورپین مستشرقین نے اپنی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنا کر اردو سے متعلق اپنی آرا پیش کیں اور ان کی یہی آرا آگے چل کر اردو لسانیات کا انمول سرمایہ ثابت ہوئیں۔

ابتدا میں ان مستشرقین کو اردو لغت اور اردو گرامر لکھنے کی ضرورت اس وقت پڑی جب سترھویں صدی عیسوی میں پہلے پہل ان لوگوں نے تجارت کی خاطر یہاں آنا شروع کیا اور ان کا سابقہ ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی زبان سے بھی پڑا۔ دوسری جانب اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لیے اور پھر اپنی حکومت کے استحکام کے لیے یہاں کی تہذیب اور کلچر کے ساتھ ساتھ یہاں کی زبانوں کی جانب بھی ان لوگوں نے توجہ دی۔ اس وقت تک اردو زبان چونکہ پورے شمالی ہند میں ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے اپنی پہچان بنا چکی تھی، لہٰذا ان مستشرقین نے اس زبان کی جانب خاص توجہ دی اور اُردو زبان کی قواعد و لغات سے متعلق بہت ساری کتابیں لکھیں۔ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کالج میں شعبۂ ہندوستانی کے صدر گل کرسٹ خود اُردو کا ایک عالم اور قواعد نویس تھا جس نے اُردو زبان کی کئی بہترین قواعدیں اور اصول اپنی یادگار چھوڑی۔ اردو سے متعلق انگریزوں کے اغراض و مقاصد اگرچہ مذہبی اور سیاسی تھے لیکن اپنے ان اغراض و مقاصد کے مدِ نظر انہوں نے جس طرح ہندوستانی زبان کی سرپرستی اور سربراہی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سے ہمارے ملکی اغراض خود بخود انجام پا گئے۔

انیسویں صدی تک آتے آتے ان مستشرقین نے لغت، گرامر اور اردو زبان کی اصلاح سے متعلق بے شمار کتابیں، پرچے اور رسائل شائع کیے، جن کی اہمیت اردو لسانیات کے مطالعے میں اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ آگے چل کر انہی کتابوں اور رسالوں کو بنیاد بنا کر اہلِ ہند نے جدید اصول کے مدِ نظر بے شمار لغات و قواعد اور اصولِ زبان مرتب کیے۔ یہیں سے اُردو میں زبان کے جدید مطالعے کی شروعات ہوئی۔ اردو میں لغت نویسی کے فروغ کے لیے ڈاکٹر مسعود ہاشمی نے ہندوستانی اور یورپی دونوں کی ابتدائی خدمات کو اہم قرار دیا ہے موصوف لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں بھی۔۔۔ سیاسی حالات اور تہذیبی عوامل، یعنی اوّلاً مسلمانوں کی اور پھر یورپی اقوام کی آمد، اردو لغت نویسی کی ابتدا اور ارتقا کا سبب بنے، چنانچہ ایک طرف تو عربی اور فارسی لغت نویسی کی روایت نے اردو لغت نویسی کے لیے بنیاد کا کام کیا اور دوسری طرف مستشرقین (یورپیوں) کی ہندوستانی لغت نویسی نے اسے جدید، سائنسی اور منطقی انداز سے ہم کنار کیا۔''(۱۴)

اب تک کی تحقیق سے جو بات سامنے آئی ہے اس کے مطابق پہلا یورپین جس نے ہندوستانی زبان کی قواعد لکھی وہ جان جوشوا کٹیلر تھا۔ یہ ہیروشیما کا باشندہ تھا اور ہندوستان ڈچ سفیر بن کر آیا تھا۔ اس نے ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت پر ایک کتاب لکھی تھی جسے ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ ایک اندازہ کے مطابق انہوں نے یہ کتاب ۱۷۱۵ء کے آس پاس تالیف کی۔ یہ کتاب لیٹن زبان میں ہے البتہ حروف کی ہیئتوں میں ہندوستانی الفاظ بعینہٖ لکھے ہیں اور ان کا املا ڈچ زبان کے طریقے پر ہے۔

کیٹلر کی کتاب طبع ہونے کے بعد دوسرے سال مشہور مشنری شلز کی کتاب ہندوستانی زبان اردو کی قواعد پر ۱۷۴۴ء میں شائع ہوئی۔ شلز،

کیٹلر کی قواعد سے واقف تھا۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچے میں اس کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس کی زبان بھی لیٹن ہے مگر ہندوستانی الفاظ فارسی اور عربی خط میں درج ہے۔ ساتھ ہی اس کے تلفظ کو لاطینی زبان میں بھی درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ شیلز کے بعد ہیڈلے کا نام آتا ہے۔ اس کی گرامر ۱۷۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کے مستشرقین نے ہندوستانی زبان کی صرف و نحو کو موضوع بنا کر متعدد کتابیں لکھیں۔ اسی وقت ایک قواعد کی کتاب ''پرتگیز گرمٹیکا اندستان'' کافی مشہور ہوئی جو لزبن میں ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک قواعد نگار بیلی ڈف کا نام آتا ہے۔ اس نے اپنے حالات خود اپنی کتاب کے دیباچے میں درج کر دیئے ہیں۔ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا۔ یہاں آ کر مدراس میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوا۔ دو سال وہاں قیام کرنے کے بعد اس نے کلکتہ کا سفر کیا۔ کلکتے میں اس کی ملاقات ایک پنڈت سے ہوئی جس سے اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی سیکھی۔ یہاں بیس سال قیام کرنے کے بعد وہ واپس لندن چلا گیا۔ وہیں اس نے اپنی کتاب ''ہندوستانی گرامر'' شائع کرائی۔ گرچہ اس کتاب میں اس نے بنگالی اور سنسکرت پر زیادہ توجہ دی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اس کتاب میں ہندوستانی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس لیے اُردو کے قدیم لغات نویسوں میں اس کا نام بھی شامل ہے۔

یورپین اسکالروں میں جان گل کرسٹ کی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ گل کرسٹ، فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں استاد اعلا تھے۔ انہوں نے اردو زبان کی صرف و نحو، لغت، لسانیات اور۔۔۔ متعدد کتابیں بڑی محنت اور لگن سے لکھیں۔ یہی نہیں عملی طور پر بھی اردو کی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے اپنی خدمت کا سلسلہ ۱۷۸۷ء سے شروع کیا اور جب فورٹ ولیم کالج میں استاد کی حیثیت سے فائز ہوا تو اس نے اپنی نگرانی میں ہندوستان کی قدیم زبانوں اور عربی و فارسی کی نایاب اور نادر کتابوں کے ترجمے کروا کر انہیں ہمیشہ کے لیے ہندوستانی زبان میں محفوظ کر دیا۔ اس کالج کا قیام بھی اگرچہ سیاسی مقاصد کے تحت ہوا لیکن اس کے زیرِ سایہ جتنی بھی کتابیں لکھیں گئیں اور جتنے ترجمے ہوئے وہ سب تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ گل کرسٹ نے خود بھی کتابیں لکھیں جو تاریخی حیثیت سے اہم تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی تصنیف کردہ کتابوں میں ایک انگریزی۔ ہندوستانی ڈکشنری (۱۷۹۰ء) اور دوسری ''قواعدِ اُردو'' (۱۸۰۹ء) کافی مشہور ہوئیں۔

ان یورپین کی یہ کوشش اگرچہ بالکل ابتدائی تھی لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت کی ہندوستانی زبان کو ایک نئی جہت عطا ہوئی اور اس کی فہم و ادراک کے نئے در کھل گئے۔ اس سے تحریک پا کر نہ صرف ہندوستانیوں نے اس کی جانب توجہ دینی شروع کی بلکہ خود یورپی علما نے بھی اس زبان کی جانب خاص طور سے توجہ دی اور اس زبان میں شاعری، نثر، قواعد اور لغت وغیرہ کی کتابیں لکھنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان مستشرقین میں خاص طور پر سے جان شیکسپیئر، موسیو گارساں دتاسی، جان ڈوسن، جان ٹی پلیٹس، ڈنکن فاربس، رچرڈسن، جان بیمز اور گریسن وغیرہ کے نام لے سکتے ہیں۔ ان مصنّفین نے انیسویں صدی میں اُردو زبان کی تاریخ، قواعد، لغات اور اصول لکھ کر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اُردو کی خدمات میں اہم رول ادا کیے ار اپنی تصانیف کے ذریعے ہندوستانیوں کے لیے لسانیاتی شعور اور مطالعے کا ایک پختہ پس منظر تیار کیا۔

لسانی مطالعے کی روایت اور اس کے محاسبے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اردو میں لسانیاتی شعور کے خدوخال ہمیں پہلے پہل لغات

اور قواعد کی شکل میں ہی ملتے ہیں اگرچہ اس کے خالق نے شعوری طور پر کوئی لسانی کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ اس کے پیچھے خود ان کے اپنے اغراض و مقاصد پنہاں تھے لیکن چونکہ انہی ابتدائی تحریروں اور کوششوں سے ہماری اُردو زبان میں لسانیاتی تحقیق کا آغاز ہوتا ہے اس لیے اردو کے لسانیاتی مطالعے کی روایت اور اس کے آغاز وارتقا میں ہم ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اس جائزے کے بعد یہ پوزیشن سامنے آتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل لسانیات زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعے تک محدود تھی۔ قیامِ پاکستان سے قبل تقابلی لسانیاتی مطالعہ کی جھلک ملتی ہے۔ توضیحی نقطۂ نظر سے زبانوں کے مطالعہ پر زور دیا گیا ہے۔ لغات ایسی منظرِ عام پر آئیں جن کی حیثیت نصابی تھی۔ قیامِ پاکستان سے قبل اُردو اور فارسی لغات نے اُردو لسانیات کے مطالعہ میں اہم کردار ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، لسانی مسائل، دہلی: پرویز بک ڈپو، ۱۹۶۲ء، ص: ۵۔۶

۲۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۹

۳۔ ایضاً، ص: ۱۹

۴۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشن، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۱۲

۵۔ مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص: ۷۳

۶۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص: ۲۳

۷۔ ایضاً، ص: ۲۳

۸۔ ایضاً، ص: ۲۵

۹۔ ایضاً، ص: ۲۶

۱۰۔ ایس اے صدیقی، ادب اور لسانیات، بھوپال: دیوبند محبوب پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۶ء، ص: ۲۰۳

۱۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۵ء، ص: ۲۸

۱۲۔ مسعود ہاشمی، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۸

۱۳۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مباحث، لاہور: مجلس ترقی اردو ادب، ۱۹۶۵ء، ص: ۱۱۱

۱۴۔ مسعود ہاشمی، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ص: ۲۲

References

1. Shaukat Sabzwari, Doctor, Linguistic Issues, Delhi: Parvez Book Depot, 1962, p.5. 6
2. Ain-ul-Haq Farid Koti, Ancient History of Urdu Language, Lahore: Orient Research Centre, 1988, p. 19
3. Ibid., p. 19
4. Khalil Siddiqui, Linguistic Debates, Quetta: Zamrud Publication, 1991, p.112
5. Masood Hussain Khan, Muqadda Tarikh Bhasha Urdu, Aligarh: EducationalBook House, 2002, p.73
6. Ain-ul-Haq Farid Koti, Ancient History of Urdu Language, p. 23
7. Ibid., p. 23
8. Ibid., p. 25

9. Ibid., p.26
10. S.A. Siddiqui, Literature and Linguistics, Bhopal: Deoband Mehboob Printing Press, 1976, p.203
11. Jamil Jalibi, Doctor,Tarikh-e-Adab Urdu, Delhi: Educational Publishing House, 1945, p.28
12. Masood Hashmi, A Critical Review of Urdu Lexicography, Delhi: Progressive Urdu Bureau, 1992, p.28
13. Abdullah, Sayyid, Doctor, Debate, Lahore: Majlis-e-Pragati Urdu Adab, 1965, p.111
14. Masoud Hashmi, Critical Review of Urdu Lexicography, p.22